ذیشان ساحل

نظمیں

مُحبّت

وہ لڑکی جو نظم نہیں پڑھتی
ایک کہانی شروع کرتی ہے
کہانی میں اتنا اندھیرا ہوتا ہے
کہ کوئی چل نہیں سکتا
کہانی میں پائی جانے والی
محبّت بھی نہیں۔
وہ اپنے پسندیدہ کردار کے ساتھ
چلنا شروع کرتی ہے
لیکن دروازے سے پہلے ہی
ٹھوکر کھا کے گر پڑتی ہے
دیواروں کو پکڑ کے
وہ کھڑے ہونے کی کوشش کرتی ہے
تو اُس کی اُنگلیاں زخمی ہو جاتی ہیں
اپنے دلکش ناخن ٹوٹے ہوے پاکے
وہ رونے لگتی ہے
کہانی میں ابھی تک اتنا اندھیرا
ہوتا ہے کہ کوئی

اُس کے آنسو نہیں دیکھ سکتا
وہ لڑکی بھی نہیں جس نے
یہ کہانی شروع کی ہے
وہ کہانی کو آگے بڑھانے کی
کوشش میں اُس نظم سے
گذرتی ہے جو اُس نے نہیں پڑھی
اور چلتے چلتے اپنی کہانی کے
آخر تک پہنچ جاتی ہے
اپنی کہانی میں دور تک چلتے ہوے
وہ اندھیرے میں رہتی ہے
اندھیرے سے گذرتی ہے
اور محبّت کو اندھیرے میں ہی
چھوڑ کر اپنی کہانی ختم کر دیتی ہے

نظم

جتنی آسانی سے
ایک نظم شروع ہوتی ہے
اُس سے بھی زیادہ آسانی سے
وہ ختم ہوجاتی ہے
کچھ کچھ اسی طرح زندگی بھی
ایک صبح اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے
اور پھر چلتے چلتے کسی
تھکے ہوئے جسم کی طرح ختم
ہونے لگتی ہے
مگر محبّت کے ساتھ ایسا بالکل نہیں ہوتا
بہت سالوں کی بارش اور

زمین کی ساخت میں تبدیلی کے بعد
کئی برس گذرنے پر
دل میں گڑے ہوئے
ایک بیج سے کونپل پھوٹتی ہے اور
دیکھتے ہی دیکھتے آسماں تک جا پہنچتی ہے
کوئی لاکھ نیچے لانا چاہے
اوپر ہی اوپر چلتی رہتی ہے
ستاروں سے بھی آگے
ہمیں ساتھ لے جاتی ہے اور
بادلوں کی حد سے نیچے اُترنے ہی نہیں دیتی

بھیّا کا گھر

بہن اسکول جاتی ہے
بھائی دفتر یا پھر
دوستوں سے ملنے ۔

بھیّا کہیں نہیں جاتے
گھر ہی میں رہتے ہیں
سدابہار کے پھولوں اور
گھنے سائے سے بھرے درختوں والا گھر
جس کی دیوار کے ساتھ
ستاروں کو دیکھے بغیر
نکلنے والی گھاس سوکھتی اور
بڑھتی رہتی ہے
جس کی کھڑکی سے کوئی آواز
سُنائی نہیں دیتی

کوئی ہاتھ ہلتا نظر نہیں آتا
جس کا دروازہ
کسی کے لیے نہیں کُھلتا
گھر کے آگے
جب چڑیاں شور مچاتی ہیں
اُنھیں کوئی منع نہیں کرتا
بھیّا بھی نہیں ۔
وہ تو کچھ بولتے ہی نہیں
سب سے ناراض ہیں شاید
چڑیوں سے بھی، مجھ سے بھی
کسی سے بات ہی نہیں کرتے
اپنے گھر سے ہی نہیں نکلتے
کوئی پکارے تو جواب ہی نہیں دیتے
اَب ہم وہاں نہیں جائیں گے
ایسا لگتا ہے جیسے بھیّا
ہم سے دور، کہیں اور
رہنے لگے ہیں
اپنے گھر میں نہیں

تمھارے لیے ایک نظم

ہمیشہ رہنے کے لیے
دنیا کتنی نامناسب جگہ ہے
اور زندگی ہر روز
پہلے سے زیادہ ناقابلِ برداشت
لیکن سعید الدین کے ساتھ
بس میں سفر کرنے والی خوشی

اور تمھاری ڈریسنگ ٹیبل پر
جلنے والی بتّی سے بہتا ہوا موم
اور آئینے پر جَمنے والا دھواں
ہر چیز کی جگہ لے لیتے ہیں
میری کتابوں میں بند پھول
خوابوں کے جنگل بن جاتے ہیں
تم فارمائکا پر جَمی گرد پہ
اپنی اُنگلیوں سے بہت سے
راستے بناتی ہو
بے شمار خالی راستوں والے شہر میں
رات گہری ہونے پر تمھاری
دوراُفتادہ موجودگی
ستاروں کو غیرضروری، چاند کو فالتو
اور سمندر کو اضافی چیز بنا دیتی ہے
تمھاری یاد اور اپنے دل پر
بڑھتے ہوئے دباؤ سے گھبرا کر
میں دعا مانگتا ہوں
شاعروں سے خدا کی مسلسل ناراضگی
کے باوجود میری دعا
ہمیشہ تم سے شروع ہوتی ہے

نظم

شاعروں سے ڈرو
خوابوں کا
ہینڈ گرنیڈ ہے ان کے پاس
اگر زیادہ کچھ کہا تو

دیوار پہ دے ماریں گے
اگر چھیننے کی کوشش کی تو
پانی میں ڈال دیں گے
جو بھی ہے ان کے پاس
تمھیں نہیں لینے دیں گے
اگر بہت سارے جمع ہو کے آؤگے
تو بھی ـ آسماں ہے ان کے پاس
بادلوں کا لشکر لا کے تمھیں ڈبو دیں گے
زمین ہے ان کے پاس، تمھیں
کہیں جانے نہ دیں گے
کشتی ہے ان کے پاس
تمھیں بٹھا کے لے جائیں گے اور کسی
جزیرے پر چھوڑ دیں گے
چڑیوں کے ساتھ رہو گے تو سب کچھ بھول جاؤگے
شاعروں کی شکل بھی اور اپنی بھی
جب وہ تمھیں واپس لینے آئیں گے
شاید تم چڑیوں کو آگے کردوگے

سفید خرگوش کی گیند

سمندر کے کنارے
چلتے چلتے گیند
آسماں کی طرف جا پہنچی ہے
بادلوں میں کھو گئی ہے
یا شاید کسی ستارے کے
ناہموار فرش پر ٹھہر گئی ہے ـ
گیند کے نہ ملنے پر

خرگوش کی آنکھیں
سرخ موتیوں کی طرح نہیں چمکتیں
آنسوؤں سے بھری رہتی ہیں
وہ خاموش بیٹھا رہتا ہے
سمندر کے پاس نہیں جاتا
آسماں کو بھی نہیں دیکھتا
جہاں گیند چلی گئی ہے —
شاید کبھی اندھیرے میں گیند
واپس آئے تو اس کے دونوں طرف کئی
چمکدار بادل یا بہت سے ستارے بنے ہوں
یا پھر بنا ہوا ہو تیز روشنی کا
ایک جال اور کچھ نظر نہ آسکے
یا پھیلا ہوا وہ سمندر
جہاں اُچھلتے اُچھلتے گیند ہمیشہ
خرگوش کو کھو دیتی ہے اور کبھی
ستارہ نہیں بن پاتی

سوچی کیا چاہتی ہے؟

رنگوں کے ایک گھر میں
رہنے والی دبلی پتلی سوچی
آخر کیا چاہتی ہے؟
ہر روز اپنے دروازے کے باہر
جمع ہونے والوں کو
وہ منع کیوں نہیں کرتی؟
لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کے
جنگلے کے پیچھے سے

وہ انھیں دیکھتی ہے تو
سب کی آنکھوں میں کیسی چمک ...
سب کے بے سکوں دلوں میں
کیسا ٹھہراؤ آجاتا ہے
سوچی یہ تماشا
بند کیوں نہیں کرتی؟
اُس کے گھر کے آگے
بے حوصلہ لوگ
قطار بنائے کھڑے رہتے ہیں
وہ ان کی مدد
کیوں کرنا چاہتی ہے؟
اُس کے گھر کے سامنے سے
لاریوں میں فوجی
بندوقیں تانے گزرتے رہتے ہیں
سوچی ان سے ڈرتی کیوں نہیں؟
عام گھریلوں عورتوں کی طرح
اپنے بالوں میں پھول لگا کے
سوچی اتنا خوش کیوں ہوتی ہے؟
برما کے لوگوں کی قسمت پر
سوچی روتی کیوں نہیں؟
ہر روز تھکے ہوے
شہریوں کو دیکھ دیکھ کے
وہ اس قدر مسکراتی کیوں ہے؟
کسی میں ہمّت نہیں کہ اُسے
ہنسنے سے روکے
یا اس کے سر میں سجے پھولوں کو نوچے
دیکھتے ہی دیکھتے
سوچی کتنی بے خوف
کتنی طاقتور ہو گئی ہے
اب تو شاید کوئی اس کی

آنکھوں میں انکھیں ڈال کر
نہیں دیکھ سکتا
یہ بھی نہیں پوچھ سکتا کہ
آخر سوچی کیا چاہتی ہے؟

زنگ

گھر کے دروازے پر لگے
کاسٹ آئرن کے پھولوں کو
دل کی شکل میں بنے
دھات کے بے جان پرندوں کو
اور خرگوش کو باہر جانے سے
روکنے والی تاروں کی باڑھ کو
زنگ لگ گیا ہے
پروں پر گرنے والی اوس نے
پرندوں کو مار دیا ہے
اور بارش کے پانی نے
تاروں کے جال کو ـ
زنگ پھیلتے پھیلتے کھڑکیوں، دروازوں والی
دنیا کو جوڑنے والے قبضوں،
تصویروں کا بوجھ اُٹھانے والی
کیلوں تک پھنچ گیا اور
مجھے ڈرانے لگا
خالی منظروں کی طرح چہرے پر موجود
آنکھوں تک جانے لگا
کتنے دن ہو گئے، کتنے دن ہوگئے
تمھارے بغیر دھڑکنے والے

محبّت میں گھرے دل تک نہیں پہنچا
گھر کے دروازے پر لگے
کاسٹ آئرن کے پھولوں ہی میں
رہ گیا، بے جان پرندوں سے
زیادہ آگے نہ بڑھ سکا

ہم پھول نہیں توڑ سکتے

محل سے باہر
بارش ہو رہی ہے
اور بادشاہ کی بہن
نوکروں کے ساتھ
بلیک کوئن کھیل رہی ہے
بادشاہ کے بچّے قومی ترانہ یاد کر رہے ہیں
ملکہ پیانو کے پاس بیٹھی
کپڑے کی گڑیا بنا رہی ہے
بادشاہ اپنی برساتی ڈھونڈ رہا ہے
چھتری وزیر اعظم کے پاس ہے۔
چار گھوڑوں والی بگّھی کے بغیر
بادشاہ کنیز کو پھول
پیش کرنا چاہتا ہے
کسی بھی حالت میں
ہم پھول نہیں توڑ سکتے
جنگی مشقوں کی وجہ سے
باغ مرمّت کے لیے بند ہے

ملکہ

ریٹائر ہونے کے بعد
اپنے کمپیوٹر پر
ملکہ، غریب عورتوں کے لیے
کینوس کے جوتے اور
گاؤن ڈیزائن کرے گی
یا شاید
کوئی ایسا اسکول کھولے گی
جہاں جلتے ہوئے ڈھول میں سے
گذرنے والے بچّوں سے
پوری فیس نہیں لی جائے گی۔
ملکہ اپنے سارے گھر، ساری گاڑیاں
اور سارے نوکیلے بروچ
آدھی قیمت پر بیچ دے گی
ملکہ خرگوش پالے گی
اور اُن کی آنکھوں کو
اندھیرے میں چمکتا دیکھ کے
ہر رات تالیاں بجایا کرے گی